اردو شاعری پر ایک نظر کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر زیبا محمود

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو گنپت سہائے پی جی کالج، سلطانپور (یوپی)

''اردو تنقید پر ایک نظر'' اور ''اردو شاعری پر ایک نظر'' دونوں کتابوں کے ایک تسلسل کا نام ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلی کتاب میں نقادوں کے افکار و اقوال کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسری کتاب میں شاعروں کی شاعرانہ صلاحیت و فنی قابلیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ''تنقید'' کے ذیل میں آتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ''اردو شاعری پر ایک نظر'' پہلے لکھی گئی اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اس کے مختصر عرصے کے بعد۔ دونوں کتابوں میں تنقید کے اصول و مباحث اور نقادوں اور شاعروں کے معیارِ فن سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے مقدمہ نگار محمد فضل الرحمان کلیم الدین احمد کے ہم خیال ساتھی اور ایک حد تک ان کے ہم درس رہے تھے۔ وہ خود بڑی علمی اور تنقیدی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے کلیم الدین احمد کو اور ان کے تنقیدی خیالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اردو میں فن نقد صحیح معنی میں ابھی تک عنقا ہے.... اگر کسی زبان میں پیمانۂ شاعری بلند نہ ہو تو اس کے نقاد کا دائرہ بھی لازمی طور پر محدود ہو جائے گا... شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں ،ایک فن، ایک صناعی بھی ہے...'' موجودہ اردو تنقید کی ''مملکت'' کے نکات و رموز تصوف سے زیادہ مبہم اور بعید از فہم ہیں۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اول، ص: ۱۵۔۱۶)

محمد فضل الرحمان نے ایک طور پر ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کی مدلل توضیح کر دی ہے۔ ان دونوں نے (کلیم الدین احمد اور محمد فضل الرحمان) اس موضوع پر انگلینڈ میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے اور دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ فضل الرحمان نثر پر کتاب لکھیں گے اور شاعری پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔ فضل الرحمان صاحب کی منصبی مصروفیات بہار میں بڑھ گئی تھیں اس لیے وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکے، لیکن کلیم صاحب نے کھل کر لکھا اور ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں کلیم صاحب نے مختلف اصنافِ سخن کو ممتاز شاعروں کے خصوصی مطالعہ کی بنیاد پر نثر کو بھی اپنے حصے میں لے لیا۔ اس کی مثال ان کی کتاب ''فن داستان گوئی'' اور ''سخن ہائے گفتنی'' ہے۔ موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ غزل میں میر، درد، سودا، قصیدہ میں ذوق، غالب، مومن، مثنوی میں میر حسن، دیا شنکر نسیم، اور زہرِ عشق، والے مرزا شوق، مرثیہ میں انیس و دبیر کی شاعرانہ حیثیت کو بطور خاص دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کے علاوہ نظیر اکبر آبادی پر بھی کھل کر بحث کی ہے۔

ان اصناف پر کلیم صاحب کے افکار سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حالی کی 'مقدمۂ شعر و شاعری' کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ حالی نے جو باتیں زیر لب کہی تھیں، کلیم صاحب نے ببانگ دہل اور مثالوں کے ساتھ انھیں پیش کیا ہے۔ وہ جگہ جگہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں، یہ بات تو حالی (اور بعض دوسرے حضرات) پہلے کہہ چکے تھے۔

کلیم صاحب نے اردو شاعری کی جو ماہیت بیان کی ہے۔ اس پر غور کر لینا مناسب ہے:

> ''شاعری کی ماہیت پر کسی نے دھندلی سی روشنی بھی نہ ڈالی اور یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی کہ شاعری اور دوسرے دماغی، دلی، روحانی اور جسمانی اعمال میں کیا تعلق ہے اور یہ بھی نہ سوچا کہ کسی ذی شعور اور ذکی الطبع آدمی کی زندگی میں شاعری کی کیا جگہ ہے یا کیا جگہ ہونی چاہئے۔ یوں کہئے ان مسئلوں سے متعلق بحثیں تو ملتی ہیں، لیکن کہیں صاف اور گہری باتیں نہیں ملتیں۔ جو خیالات ہیں وہ مبہم، مثل زلف شام تاریک اور اکثر و بیشتر یہ خیالات براہ راست یا بالواسطہ مشرقی و مغربی ادب سے مستعار لے کر توازن و تفرقہ کے بغیر اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ تنقید کی کسوٹی پر ان مانگی ہوئی چیزوں کی جانچ پرکھ نہیں کی گئی اور نہ اس بات کی ضرورت سمجھی گئی۔ کھری کھوٹی سب چیزیں ایک ہی نظر سے دیکھی گئیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اول، ص: ۳۱۔۳۰)

کلیم صاحب نے شاعری کی طرح شاعر کے متعلق بھی مختلف طریقوں سے بحث کی ہے۔شیلی کا یہ قول نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"A poet is a nightangle who sits in darkness and sings to cheer its own solitude with sweet sounds, his auditors are as men entranced by the melody of an unseen musician, who feel that they are moved and softened, yet know that whence or why. "Shelley-"A Defence of poetry"

''ہاں تو شاعر بلبل نہیں وہ صاحب دماغ انسان ہے اور صرف یہی نہیں، صاحب دماغ انسان تو بہت ہوتے ہیں۔شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔وہ بلبل کی طرح عالم بے اختیاری میں گاتا نہیں۔وہ جو کچھ کہتا ہے سمجھ بوجھ کر کہتا ہے۔بلند ترین ادراک کے ساتھ اس کی قوتِ حاسّہ کا فیض ہے کہ وہ ماحول سے برابر اثرات قبول کرتا رہتا ہے۔وہ جس چیز کو دیکھتا سنتا ہے، سونگھتا چھوتا ہے اور جس چیز کا ذائقہ لیتا ہے۔ یہ سب چیزیں اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہیں اور یہ اثرات فوراً مٹ نہیں جاتے، قوتِ حاسّہ انھیں محفوظ رکھتی ہے اور انھیں مربوط اور مسلسل کر کے ایک نئی شکل میں پیش کر سکتی ہے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اول، ص:۳۷)

کلیم صاحب شاعر کے تخیل کے متعلق فرماتے ہیں:

''دور و نزدیک کی سب چیزوں پر شاعر کے تخیل کا تصرف ہے اور وہ ان چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر سکتا ہے، مختلف اور متضاد خصوصیتوں میں توازن اور اتفاق پیدا کر سکتا ہے، پرانی اور جانی ہوئی چیزوں میں نیا پن اور تازگی ڈال دیتا ہے، عام اور خاص خیال اور نقوش انفرادی اور عالم گیر باتوں میں میل دے کر نئے نقشے بناتا ہے، تیز اور گہرے جذبات کو نئی مناسبت اور تنظیم کے ساتھ پیش کرتا ہے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اول، ص:۳۸)

اس کے بعد کلیم الدین صاحب صنف غزل پر اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''غزل اردو شاعری کی جان ہے۔اس صنف کی خصوصیتوں کا اندازہ کرنے کے لیے کسی ایک غزل کا تجزیہ کافی ہوگا.....غزل کی بے ربطی مسلم ہے اور اسی بے ربطی کی وجہ سے غزل مغربی ادب میں مقبول نہ ہو سکی۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اول، ص:۵۸)

کلیم صاحب نے چند بڑے شاعروں کی بعض غزلوں کا تجزیہ کیا ہے۔وہ شعرا ہیں میر، سودا، غالب اور مومن، یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔کلیم صاحب نے ان شعرا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا ہے، لیکن وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر ان کے اشعار میں تسلسل ہوتا تو یقیناً یہ اچھے اور بڑے شاعر ہوتے۔اقبال کی شاعری میں جہاں انھیں بہت سی خامیاں نظر آئیں، وہاں ان کی بعض غزلوں میں تسلسل اور خیالات میں ربط باہمی کی وجہ سے دوسرے غزل گویوں کے مقابلے میں حسن نظر آیا۔کلیم صاحب نے غزل کی یکسر نفی نہیں کی بلکہ جو باتیں وہ نظم میں دیکھنا چاہتے تھے، وہ اگر کسی غزل گو کے یہاں ملیں تو ان کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا۔

صنف قصیدے کے بارے میں حالی نے جو کچھ کہا، کلیم صاحب نے اپنے لہجے میں اسے دہرایا ہے، لیکن اس صنف کے ایک پہلو سے وہ متاثر ہیں اور وہ یہ کہ اس میں کہیں کہیں تسلسل یا ارتقائے خیال کا لحاظ رکھا گیا ہے۔انھوں نے میر، مومن اور غالب کے قصائد سے بعض اشعار نقل کیے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں، مگر تعریف کا سبب زیادہ یہ ہے کہ جو عناصر قصائد کی خوبیوں میں شمار ہوتے ہیں وہ ان میں نہیں ہے۔غالب کے قصیدے ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''یہ مثال اپنے رنگ کی ایک ہی چیز ہے، لیکن چونکہ قصیدہ کی عام ڈگر سے ہٹ کر ہے، اس لیے اس کی طرف کچھ توجہ نہ ہوئی اور کسی نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا اور اس نئی راہ پر رہروی نہ کی۔قصیدہ کے رسمی محاسن کچھ اس طرح جم گئے تھے کہ کسی نئی راہ کی طرف خیال بھی نہ جاتا تھا۔میں نے مومن، میر اور غالب سے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ سب کے سب عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں اور اسی لیے انھیں سراہا نہیں گیا۔کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہاں قصیدہ کے محاسن نہ سہی، شاعری کے محاسن تو ہیں جن سے عموماً قصیدے خالی ہوتے ہیں۔انھیں تو بس یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ انھیں قصیدہ کہنا غلط ہے۔اسی سے ظاہر ہے کہ نقالی سے ایسی طبیعت خوگر ہو گئی تھی کہ نئی چیزیں سامنے آتی تھیں تو بھی ان کی طرف آنکھیں نہیں اٹھتی تھیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد اول، ص:۲۵۶)

صنف مثنوی کے بارے میں حالی نے کہا تھا کہ یہ بہت کارآمد صنف ہے۔کلیم الدین احمد صاحب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور مزید کہا:

''غزل اور قصیدہ کے مقابلے میں مثنوی میں زیادہ وسعت اور

تنوع کی گنجائش ہے۔مثنوی میں رزمیہ شاعری ہوسکتی ہے اور نئے نئے افسانوں کی ایجاد بھی ہوسکتی ہے،صنف مرثیہ پر کلیم صاحب نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور اردو کے بڑے مرثیہ نگار انیس پر ایک مکمل کتاب۔''میر انیس'' لکھ دی ہے۔وہ اس قول سے متفق نہیں کہ مرثیہ کو رزمیہ کا درجہ ملنا چاہئے۔رزمیہ کی خصوصیات کچھ اور ہوتی ہے جو میر انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں مفقود ہیں۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد اول، ص:۳۱۲)

کلیم صاحب مرثیہ کے مخالف نہیں ہیں وہ اس کی کمیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔وہ مرثیہ نگاروں کے جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کو اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

''بہرکیف،شخصیت کی تعمیر نہ سہی جذبات نگاری بڑے پیمانہ پر ہے۔قسم قسم کے جذبات وکوائف،گوناگوں حسیات وتاثرات کی عکاسی ملتی ہے۔جرأت،فیاضی،رحم دلی،ہمدردی،حلم بردباری، غیظ وغضب،غم وغصہ،امید،یاس،شرم وحیا،غیرت ایک طرف تو کم ہمتی،شقاوت،خونخواری،حسد ورشک،بغض وکینہ دوسری جانب سب کے سب ملتے ہیں۔اسی لیے حسیات کی دنیا وسیع ہے۔خصوصاً اردو شاعری کی دوسری صنفوں کے مقابلے میں جہاں تنگی سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے،یہ وسعت قابلِ تعریف ہے۔''(اردو شاعری پر ایک نظر،جلد اول:۳۹۴)

کلیم صاحب نظیر اکبرآبادی سے ایک حد تک متاثر ہیں اور ان کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔نظیر کے بارے میں کلیم صاحب کے بعض خیالات یہ ہیں:

''نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے،جب غزل عالم گیر تھی،جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے، ایسے زمانے میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور آزادیٔ فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر،جلد اول،ص:۴۳۶)

نظیر اکبرآبادی کے لیے ان کے یہ الفاظ قابل صد ستائش ہیں:

''ہاں نظیر نے غزل میں نئی راہیں نکالیں،اس میں نئی وسعتیں پیدا کیں اس میں نظم کی خوبیاں داخل کیں۔''(اردو شاعری پر ایک نظر،جلد اول،ص:۴۳۷)

کلیم صاحب نے نظیر کو اچھا شاعر صرف اس لیے سمجھا کہ ان کے یہاں نظم نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔مضامین میں تنوع ہے،زبان عام بول چال کی ہے،ہندی کے الفاظ بوقت ضرورت استعمال میں لانے سے گریز نہیں کرتے۔غرض اردو شاعروں میں نظیر ان کے معیارِ شاعری پر بڑی حد تک پورے اترے۔

کلیم الدین احمد نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے دوسرے حصّے میں دور جدید کی شاعری سے بحث کی ہے۔دور جدید کا مطلب وہ زمانہ ہے جب ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں مغربی ادبیات کا چلن شروع ہوا،علی گڑھ تحریک وجود میں آئی اور کرنل ہالرائڈ کے ایما پر ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آیا اور طرحی غزلوں کی جگہ موضوعات پر نظمیں لکھی اور پڑھی گئیں۔محمد حسین آزاد اور حالی اس انجمن کے معمار بھی تھے اور اس کے اہم شعرا بھی۔ حالی کی تنقید پر وہ بہت کچھ لکھ چکے تھے اور ان کی شاعری پر بھی جگہ جگہ مختصر تبصرے بھی کیے تھے،لیکن جدید شاعری میں بھی ان کی اہمیت تسلیم کی۔

کلیم الدین صاحب محمد حسین آزاد کو عصر حاضر کا پیش رو سمجھتے تھے۔ انھوں نے آزاد کی خدمات کی تعریف کی اور کہا:

''آزاد نے اظہارِ خیال کے لئے مثنوی کی راہ اختیار کی۔ مضمون کے لحاظ سے مثنویاں دو طرح کی ہیں:اخلاق آموز یا مشاہدۂ فطرت کی ترجمان۔چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو دونوں قسم کی نظموں میں ملتی ہیں۔طرز ادا سیدھا سادہ ہے،لیکن یہ سادگی شوکت لیے ہوئے ہے۔نقوش اور تشبیہیں کم ہیں اور جو ہیں وہ طبع زاد ہیں۔یا فطرت کے مشاہدہ کا نتیجہ۔مبالغہ ہے، لیکن کبھی حدود معقول سے تجاوز نہیں کرتا۔آزاد کبھی از خود رفتہ نہیں ہوتے۔ہمیشہ اپنے کو لیے دیے ہوئے رہتے ہیں۔لب و لہجہ عام گفتگو جیسا ہے۔آواز کبھی بلند و تیز نہیں ہوتی۔خیالات اخلاقی قسم کے ہیں۔اخلاقی نظموں میں تو یہ بات ناگزیر تھی، لیکن دوسری نظموں میں بھی اسی قسم کے مضامین ہیں۔''(اردو شاعری پر ایک نظر،جلد دوم،ص:۲۰)

حالی عہد نو کے بھی بڑے شاعر تھے اور رنگ قدیم کے بھی۔ان کی غزلیں آج قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں،جب انھوں نے نظم نگاری کی طرف توجہ کی تو،''مدجزراسلام یعنی مسدس'' جیسی نظمیں لکھیں۔کلیم صاحب کا اعتراف ہے کہ''حالی کی کائنات ان کا مسدس ہے'' مگر مجموعی طور پر وہ حالی کے نئے طرز کی شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔وہ کہتے ہیں:

''کہنا پڑتا ہے کہ آزاد کی طرح حالی بھی اوسط درجہ کا دماغ رکھتے تھے۔ان کے خیالات بھی سطحی ہیں۔کچھ بلند پردازی یا گہرائی

نہیں۔ ان کا طرز ادا آزاد سے کچھ زیادہ سادہ اور بے رنگ ہے۔نثریت اس قدر غالب ہے کہ اگر وزن کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کے شعروں کو شعر سمجھنا مشکل ہو جائے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۳۴)

اکبرالہٰ آبادی کا بھی ذکر کلیم صاحب اچھے عنوان سے کرتے ہیں۔ وہ انھیں قابلِ لحاظ شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے:

''اکبر نے جو کچھ کیا وہ ناسمجھی اور ہٹ دھرمی کی بنا پر نہیں کیا۔ وہ ترقی کے خلاف نہ تھے۔ترقی کی طرف قدم اٹھے اور ضرور اٹھے لیکن ذرا سوچ سمجھ کر۔نئی چیزیں اچھی ہیں، پرانی چیزیں بری ہیں، یہی نقطۂ نظر عام ہو چلا تھا۔ وہ اس بے عقلی کے مخالف ہیں۔ترقی کے خواہاں ہیں اور جدید قومیت کی تعمیر سے ہراساں نہیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۸۵)

شوقؔ کو بھی ایک قابلِ لحاظ شاعر تسلیم کرتے ہیں اور ان کی جدت طرازی کی داد دیتے ہیں۔کلیم صاحب کا خیال ہے:

''اردو شاعری میں قوتِ ایجاد کی نمایاں کمی رہی اس وجہ سے شوقؔ کی جدّت طرازی خاص اہمیت رکھتی ہے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۱۲۲)

کلیم صاحب تقابلی مطالعہ اور موازنہ کا سلیقہ جانتے ہیں، لیکن ان کا فن اس مقام پر اجاگر ہوتا ہے جب وہ کسی شاعر کی خامیاں گناتے ہیں اور اپنی تائید میں اس شاعر کی خوبیاں بتاتے ہیں جس کی خامیاں وہ کہیں اور گنا چکے ہوتے ہیں۔

اقبال پر انھوں نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں وہاں اظہارِ خیال کیا ہے جب وہ عہد نو کے شاعروں کا ذکر کرتے ہیں ''آزاد، حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی، شوق، اکبر کے بعد وہ اقبال کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ پھر انھوں نے اقبال پر ایک مستقل کتاب ''اقبال-ایک مطالعہ'' لکھی جس میں اقبال کی خامیوں اور محاسن پر کھل کر اور مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ دراصل اقبال کی شاعری کلیم صاحب کے لیے ایک بیساکھی ثابت ہوئی اور وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس بیساکھی کے سہارے دوسرے بڑے شاعروں کی خامیاں سامنے لاتے ہیں۔''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

'' تنزل حال' عروج گزشتہ، بشارت مستقبل، یہی اقبال کی شاعری کا سنگ بنیاد ہیں۔انھیں کو وہ بار بار مختلف ڈھنگ سے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اقبال کا مطمح نظر وسیع تھا، ان کا دماغ بلند پایہ تھا، ان کے بلند اور عمیق خیالات نے قومی و ملّی شاعری کی فضا بدل دی۔ان کی آواز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ مسلمانوں کا جمود رفع ہو گیا۔ان کے دل جاگ اٹھے اور ان کی رگوں میں زندگی کی روح دوڑنے لگی۔ ہندوستان کے دورِ حاضر کا مؤرخ مسلمانوں کی بیداری کا ایک اہم ترین سبب اقبال اور ان کی نظموں کو قرار دے گا۔ اقبال نے اپنی قوم و ملّت کی ایسی گرانقدر خدمت کی ہے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال اردو میں بہترین قومی و ملّی شاعر ہیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص: ق۱۴۴۔۱۴۵)

کلیم صاحب نے اپنے ہم عصر مشہور شعرا کے کلام کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان میں ہیں سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، چکبست، افسر میرٹھی، اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی۔ان میں سے اکثر شعرا نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر مجموعی طور پر انھیں نظم نگار شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ سیماب کے بارے میں کلیم صاحب نے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے:

''سیماب غزل میں پاکیزہ تغزل کے خلاف نہیں، لیکن وہ شاعری کو تغزل محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ شعرا غزل گوئی کے علاوہ اصلاحی، اخلاقی، قومی، ملکی اور سیاسی نظمیں کہنے کی عادت ڈالیں۔ وہ اس مشورے پر خود بھی عمل کرتے ہیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۲۰۳)

کلیم صاحب چکبست کا یہ مشہور شعر نقل کرتے ہیں:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اور اس پر تبصرہ کرتے ہیں:

''جذبات بھڑکانے میں یہ شعر کامیاب ہو تو ہو، لیکن اسے شعر کہنا ادبی گناہ ہے۔ یہ حالت صرف اس شعر کی نہیں، ساری نظمیں اسی معیار کی ہیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۲۱۳)

حفیظ جالندھری کی قوتِ اختراع کے کلیم صاحب قائل ہیں۔ وہ ان کی جدت طرازی کی بھی داد دیتے ہیں۔ان کی قوت ایجاد کی مثال میں وہ ''شاہنامہ اسلام'' پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''حفیظ نے بھی اپنی شاعری کا ایک حصّہ اس کام کے لیے وقف کر دیا، لیکن وہ کورانہ تقلید نہیں کرتے۔ وہ اسلام میں شاہنامہ کی نقالی نہیں۔اس میں خیالی رزمیہ شاعری نہیں اس نظم میں حفیظ

گویا اسلامی تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور موضوع اور پیرایہ کے لحاظ سے یہ سراسر نئی چیز ہے، لیکن کامیابی کے لیے صرف جدّت کافی نہیں اور یہ جدّت نظم کی خامیوں کو نہیں چھپا سکتی۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۲۱۴)

اختر شیرانی رومانیت کے شاعر ہیں۔ کلیم صاحب نے انگریزی رومانیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے اسی لئے شاید انھیں اختؔر کے یہاں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''رومانیت ان کی نظموں میں ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کے جذبات رومانی قسم کے ہیں جو نوجوانوں میں عام طور سے پائے جاتے ہیں۔ ذہنیت میں بھی وہی رومانی کچّا پن ہے اور شاعری کے تصور میں بھی یہی کچی رومانیت ہے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۲۴۷)

کلیم الدین احمد نے ترقی پسندی کی جس مدلل انداز میں مخالفت کی، اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ وہ تجدد، ترقی اور تبدل کے ہم نوا تھے اور چاہتے تھے کہ روایتی افکار اور اسالیب سے جہاں تک ہو سکے احتراز کیا جائے، لیکن ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ترقی کے نام پر ادب کو پروپیگنڈہ بنا دیا جائے۔ وہ ترقی پسند تحریک کو پروپیگنڈے کی ایک منظّم تحریک سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس تحریک کے تمام مشاہیر شعرا کا عمیق مطالعہ کیا اور ان کے اشعار کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا کہ ادب کے خوش گوار ارتقا کو اس نے سخت نقصان پہنچایا۔

جوش عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے، لیکن کلیم صاحب نے ثابت کیا کہ ان کے یہاں الفاظ کی تکرار، معانی کی سطحیت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ترقی کے نام پر انھوں نے تنزل کی راہیں طے کیں اور دانشوروں کے دماغ کو مفلوج کر دیا۔ جوش کے بعض مضامین کو وہ اقبال کی نقالی بتاتے ہیں اور ایسی نقالی جو تضحیک کا سامان فراہم کرتی ہے۔ جوش کی بعض نظموں کے تجزیے کے بعد وہ کہتے ہیں:

''جوش سے پہلے اقبال نے بھی یہی آواز بلند کی تھی، لیکن اقبال کی آواز میں نرمی اور ملائمت بھی تھی، لہجہ میں متانت اور سنجیدگی تھی اس لیے یہ آواز گراں نہ ہوتی ہے۔ ان کی باتوں میں بلندی اور گہرائی تھی۔ شعریت تو اکثر اقبال کے بس کی بھی بات نہ تھی۔ ان کے خوشہ چیں تو شعریت کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتے۔ پھر ان کی باتیں بالکل معمولی اور سطحی اور مانگی ہوئی ہیں اور ان کی آواز کرخت اور بھدّی ہے۔ ان کے لہجہ میں متانت اور سنجیدگی بالکل نہیں۔ یہ تہذیب کے نئے پروردگار تہذیب سے ناآشنا اور متانت اور سنجیدگی سے نابلد ہیں۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۲۶۷)

کلیم صاحب آزاد نظم کے خلاف نہیں بلکہ وہ اسے اچھی صنف سمجھتے ہیں۔ اردو کے جن شعرا نے آزاد نظمیں کہی ہیں، ان میں ن-م-راشد اور میراجی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ راشدؔ کی بعض آزاد نظموں کے ضمن میں کہتے ہیں:

''تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور آزاد نظم میں ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جا سکتا ہے۔ اس میں بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے۔ تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سی ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے، لیکن یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے لطیف و نازک قوت حاسّہ کی ضرورت ہے اور پھر تکنیک پر پورا پورا قابو بھی۔ اردو نظموں میں سانچہ بدلتا ہے، لیکن یہ تبدیلیاں تجربے کی دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوتی ہیں۔ آزاد نظم کا ڈھونگ قائم رکھنے کے لیے بڑی بڑی سطریں، بڑے چھوٹے مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ اگر مصرعے بڑے چھوٹے نہ ہوں تو پھر آزاد نظم کیسے ہو.....اور کبھی یہ تبدیلیاں اتفاقی ہوتی ہیں یا اٹکل پچو ہوتی ہیں۔ یعنی ان خارجی تبدیلیوں میں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ تبدیلیاں بہت بھدّی اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۴۵۳-۴۵۴)

کلیم الدین احمد نے قدیم مشہور شاعروں کی غزلوں پر جو تبصرہ کیا تھا، اس کا ذکر آ چکا ہے، وہ عصر حاضر کے چند نامور غزل گویوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جیسے حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری اور جگر مرادآبادی۔ جگر مرادآبادی کو وہ کوئی خاص درجہ نہیں دیتے۔ ان کی شاعری پر ان کا تبصرہ نقل کرنا کافی ہے:

''جگر مرادآبادی کی شاعری حسرت، فانی اور اصغر کی شاعری کی برابری نہیں کر سکتی ہے۔ جگر صاحب طرز نہیں ہیں۔ وہ شروع میں صاف، سیدھے، سلیس و رواں شعر موزوں کرتے ہیں۔ پھر ''جدید رنگ تغزل'' سے متاثر ہو کر اپنے شعروں میں شان و شوکت، ظاہری ادبی رنگ کی آمیزش کرتے ہیں۔ پھر شہرتِ عام کی خاطر پرانے رنگ تغزل کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور پھر اسی شہرتِ عام کی خاطر ترقی پسندی کی طرف مائل ہوتے

ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ جگر کی شاعری قدیم و جدید رنگ تغزل رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا مضحک بن گئی ہے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۵۹۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق گورکھپوری کے بارے میں کلیم صاحب کچھ گومگو میں مبتلا ہیں۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، کہہ نہیں پاتے اور جو نہیں کہنا چاہتے وہ کہہ جاتے ہیں:

''فراق گورکھ پوری ان چند پڑھے لکھے شعرا میں ہیں جو مغربی ادب سے بھی واقف ہیں۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں اور اپنی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور فن شاعری پر بھی غور وفکر کرتے ہیں اور اس غور وفکر میں مغربی خیالات سے استفادہ بھی کرتے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ مغربی ادب خصوصاً مغربی شاعری سے واقفیت کے بعد وہ غزل کی خامیوں کو محسوس نہیں کرتے ہیں۔ یوں کہنے کو تو وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور ان کی بہت ساری غزلیں یا غزلوں کے زیادہ سے زیادہ اشعار مربوط ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فراق بھی غزل گو شاعر ہیں۔ اگر دوسرے اردو شعرا غزل کو شاعری کی تکمیل سمجھیں تو چنداں مضائقہ نہیں، لیکن فراق کی یہ بے خبری باعث استعجاب و تاسف ہے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص:۶۰۱)

اردو تنقید پر ایک نظر ہو یا اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد کے نظریات ہر دو جگہ نمایاں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو ادبیات کو بلند مقام ملے، مگر اس خواہش کی تکمیل میں وہ سنگ ریزوں سے کام لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ناقدانہ شخصیت پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ میں اپنی بات پوری کرنے سے پہلے پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا ایک طویل اقتباس نقل کر رہی ہوں جس سے کلیم صاحب کی تنقید کے خدو خال واضح ہو جاتے ہیں:

''تنقید نگاروں کے اس ہجوم میں چند ایسی شخصیتیں بھی نظر آتی ہے جن کی کاوشوں سے تنقید کی اہمیت و افادیت کا احساس عام ہو چلا ہے۔ ان میں پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کلیم الدین کے نام سرفہرست ہیں۔ آخر الذکر نے سب سے زیادہ توجہ، انہماک اور ریاض سے کام لیا ہے اور وہی اردو کے سب سے بدنام نقاد بھی ہیں۔ کلیم الدین احمد کی بدنامی کا سبب دراصل ان کے استہزائیہ، مضحکانہ اور مسخر آمیز جملے اور فقرے ہیں جو نہ تو ان کے شایانِ شان ہیں اور نہ خود تنقید کے ان کا طرز تحریر استدلالی ہے۔ وہ تخلیقات اور رجحانات کا تجزیہ کرتے کرتے اور اثبات و نفی میں دلائل پیش کرتے کرتے استنباط نتائج کی منزل پر پہنچتے ہیں اور گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا تو ایک تشنجی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے اور ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں جن کے بارے میں ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ وہ نہ تو ان کے شایانِ شان ہوتی ہیں اور نہ تنقید کے۔ بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد شاعر کو ادیب کو اور خود اپنے کو ایک سائنسداں کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں اور دو دو کا جواب چار اور صرف چار سننا چاہتے ہیں، لیکن ان کا یہ مطالبہ صرف سماعی مفروضات پر نہیں ہوتا، ان کے استدلال، ان کے مطالبات اور ان کے تجزیے کی بنیاد علم و دانش، شعر و ادب کے عمیق مطالعے پر ہوتی ہے۔ انھیں عام طور پر مغرب زدہ بتایا جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مشرقی بالخصوص اردو ادبیات کے منتہی نہیں ہیں۔ اردو ادبیات کی ایک ایک رگ سے وہ اتنا ہی واقف ہیں جس کی توقع کسی بڑے عالم یا نقاد سے کی جا سکتی ہے۔ وہ تنقیدیں پڑھ کے تنقید نہیں لکھتے، وہ ادبیات کے اماموں کا صرف نام سن کر ان کے حوالے نہیں دیتے بلکہ وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے متن ان کے اسلوب کو سمجھ کر کچھ لکھتے ہیں اور ان کے ایک ایک نقص کو اس مقصد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ لوگ جسے خوب سمجھ رہے ہیں، اس سے خوب تر کے لیے جدوجہد کریں، وہ اپنے ماضی اور اپنے حال سے مایوس نظر آتے ہیں، لیکن ان کی قوتِ تنقید کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب انتہا پسندی کی یہ نقاب ان کے چہرے سے ہٹا دی جائے۔ ایک نقاد کو جس وسعت مطالعہ، رقت نظر اور قوتِ فیصلہ کا حامل ہونا چاہئے وہ ان میں موجود ہے۔ ان کی تنقیدیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں اور ادبیات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ ادھر ان میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا ہو رہی ہے انتہا پسندی اور تضحیک و تمسخر کی جو فضا ''اردو شاعری پر ایک نظر'' اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں ملتی ہے وہ فضا ''عملی تنقید (حصّہ اوّل)'' میں نہیں ملتی۔ ان میں ان کا تجزیاتی اور استدلالی انداز پختہ تر نظر آتا ہے اور انتہا پسندی اور تضحیک و تمسخر کی صرف جھلک ملتی ہے۔ (بازیافت مجموعہ مضامین پروفیسر محمود الٰہی، ص:۲۷۳-۲۷۲) ◆◆◆